دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

(۴)

سورۂ الم نشرح کا نزول | اسی کے قریب زمانے میں جبکہ دعوتِ اسلامی کے آغاز کی مشکلات حضورؐ کے لیے سخت پریشان کن ثابت ہو رہی تھیں، آپ کی تسلی کے لیے سورۂ الم نشرح نازل ہوئی جس کے بعض متعلقہ اجزاء یہاں مع تشریح نقل کیے جاتے ہیں:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (آیت ۱) "(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

اس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون خود صاف ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو علی الاعلان دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دور میں پیش آ رہی تھیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے نبیؐ، کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں:-

۱۔ سورۂ انعام آیت ۱۲۵ میں فرمایا فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے"۔ اور سورۂ زمر آیت ۲۲ میں فرمایا اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو....."

ان دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردُّد سے پاک ہو کر اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اُصولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

۲۔ سورۂ شعراء آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصبِ عظیم پر مامور

کرکے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انہوں نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ - "میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے"۔ اور سورہ طٰہٰ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ - "میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے"۔ یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تن تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو سرانجام دینے میں بھی اسے تامل نہ ہو، اور نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں ہی معنی مراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اس حنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلینِ توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی۔ (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵ میں کر چکے ہیں)۔ لیکن آپ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہ راست کیا ہے، اس لیے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خلجان کو دور کر دیا اور وہ راہ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپ کو اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپ اس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ معاشرے میں کسی سرو سامان اور ظاہراً کسی پشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں، اس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپ کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ پس

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ، یہ شرح صدر کی بے بہا دولت جب اللہ نے آپؐ کو عطا کر دی ہے تو آپ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اِس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟[1]

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (آیت ۴) اور تمہاری خاطر تمہارے ذِکر کا آوازہ بلند کر دیا[2]

یہ بات اُس وقت فرمائی گئی تھی جب کہ قریش کے سارے دشمنانِ اسلام حضورؐ کو بدنام کرنے میں لگے ہوئے تھے اور خاص طور پر حج کے زمانہ میں ولید بن مُغیرہ کی تجویز کردہ اسکیم کے مطابق (جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جا کر آپ کے خلاف ایسی باتیں پھیلائی جا رہی تھیں جن سے لوگ آپ سے بدگمان ہو کر آپ سے دُور بھاگنے لگیں؟ پھر اس حالت میں یہ آپ کے رَفعِ ذکر کی خوشخبری کیسی تھی؟

سب سے پہلے تو آپ کے رفعِ ذِکر کا کام اللہ تعالیٰ نے خود آپ کے دشمنوں ہی سے لیا۔ کفارِ مکّہ نے آپ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کی وجہ سے آپ کا اسم گرامی عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور مکّہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں ہی نے آپ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اس کے "جادو" سے متاثر ہونے والے لوگ کیسے ہیں اور ان پر اس کے "جادو" کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفارِ مکّہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا لوگوں میں یہ جستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اِس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سُنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر بلند اور پاکیزہ ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی

---

[1] بعض مفسرین نے شرح صدر کو شقِّ صدر کے معنی میں لیا ہے اور اس آیت کو اُس معجزۂ شقِّ صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے، قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرح صدر کو کسی طرح بھی شقِّ صدر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الآیۃ علی شقّ الصدر ضعیف عند المحققین "محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شقِّ صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے"۔

[2] اس سے پہلے آیات ۲-۳ کی تشریح گزر چکی ہے۔

شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرتِ مدینہ کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دُور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفع ذکر کا پہلا مرحلہ تھا جو اس سورہ کے نزول کے وقت گزر رہا تھا اور سب اس کے اثرات دیکھ رہے تھے۔

اس کے چند ہی سال بعد اس کے دوسرے مراحل پیش آئے جن کو اُس وقت کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا، نہ اُن کا تصوّر کر سکتا تھا۔ بس اللہ ہی اُن کا علم رکھتا تھا، اور اسی نے ان کی بشارت حضورؐ کو دی۔ ہجرت کے بعد منافقین، یہود، اور عرب کے تمام اکابر مشرکین ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینۂ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زُہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبر گیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راستبازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مُسخّر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعہ سے حضورؐ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی کوشش کی، مگر آپ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ دس سال کے اندر حضورؐ کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اُس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی صدا سے گونج اُٹھا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دور سے آپ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور وہاں دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآوازِ بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکرِ خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضورؐ کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ، اس وقت کے شدائد و مصائب سے تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ تمہارے رفعِ ذکر کا تو ہم نے وہ انتظام کیا ہے

جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ حدیث میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفع ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، مسند ابویعلیٰ، ابن المنذر، ابن حبان، ابن مردویہ، ابونعیم)۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (آیات: ۵، ۶)

پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔

اِس بات کو دو مرتبہ دُہرایا گیا ہے تاکہ حضورؐ کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اِس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر تک رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی اچھے حالات چلے آرہے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں، لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی لگا چلا آرہا ہے۔

باب (۹)

ہجرتِ حبشہ

دین میں ہجرت کی اہمیت قرآن مجید میں جہاد کے بعد دوسری اہم ترین چیز جس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ہجرت ہے۔ اس ہجرت کی اسلام میں کیوں اتنی اہمیت ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ اہم اگر کوئی چیز ہے تو وہ نہ اس کا اپنا وطن ہے، نہ اس کی قوم ہے، نہ اس کی روٹی ہے، نہ اس کا پیٹ ہے، بلکہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ جن اُصولوں پر وہ ایمان لایا ہے ان کے مطابق وہ زندگی بسر کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے۔ اگر وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو اس کے لیے آزادی کیا خود زندگی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں قربان کر دینا زیادہ بہتر

سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ اُن اصولوں کو قربان کر دے جن پر اُس کے ایمان کا دار و مدار ہے اور جن کے متعلق وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اُصول حق ہیں اور خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے ہیں۔

عرب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن پیروؤں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ اسی بنا پر تھی عرب اور قریشی اور مکی ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے ملک، اپنے قبیلے اور اپنے شہر میں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، لیکن کوئی آزادی اگر حاصل نہیں تھی تو صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے وطن کو چھوڑا اور ایک دوسرے ملک میں چلے گئے جہاں ایک دوسری قوم آباد تھی اور ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو کیوں کی؟ آپ مکہ کے باشندے تھے۔ مکہ میں آپ کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو مکہ کے کسی شہری کو حاصل ہو سکتے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کو بھی وہ تمام حقوق حاصل تھے جو کسی قریشی کو قریشی ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے تھے۔ لیکن جس چیز کی وجہ سے آپؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے گھر بار چھوڑا، رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، جائدادیں چھوڑ دیں اور تن کے کپڑوں میں نکل کھڑے ہوئے وہ چیز یہ تھی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُن کو آزادی میسّر نہیں تھی۔ اسی آزادی کے لیے انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شہر میں جا کر آباد ہوئے۔

قرآن میں مسلمانوں کو ہجرت کے لیے تیار کیا جاتا ہے

مکہ میں جب مسلمانوں پر ظلم کی حد ہو گئی تو قرآن مجید میں اُن کو ہجرت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ - كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ - ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ - وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ -

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ۔ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ــــ اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی جانور

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا - اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ -

ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے - اللہ ہی اُن کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے -

(العنکبوت: ۵۶ تا ۶۰)

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اِس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا۔ جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ اس آیت میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر وہ دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ تم جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو کر آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہوگا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے؟ جان پر قربان کیا ہوا ایمان یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

تیسری اور چوتھی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر بالفرض اگر تم دُنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دُنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی رہے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہر حال ہوگی

اور زری تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا۔ جو لوگ ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہوں، جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہو اور منہ نہ موڑا ہو، جنہوں نے ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کیا ہو، جنہوں نے کفار و فساق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہو اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی ہو، جنہوں نے بھروسہ اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا ہو، جو اسبابِ دنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے ہوں اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے ہوں، ایسے مومن و صالح بندوں کا اجر ان کے رب کے ہاں ضائع نہ ہوگا۔ وہ اس دنیا میں بھی ان کی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین اجر دے گا۔

آخر میں یہ تلقین کی گئی کہ ہجرت کرنے میں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی تمہیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا اہلِ ایمان یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہاریں کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے انہیں بھی دے گا۔

دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطع نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ اِن حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں، اور قدم اُٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت اِس طرح کے حالات بدلتے ہی اُن لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں۔ انہی کی قربانیاں آخرکار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا (اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو،

رَبَّكُمْ ۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۔ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔

اپنے رب سے ڈرو ۔ جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویّہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے ۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے ۔ صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا ۔

(الزُّمَر ۔ آیت ۱۰)

یہاں بھی اہلِ ایمان کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو گئی ہو تو اس کی زمین وسیع ہے ، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو ۔ اس کے ساتھ ان کو یہ خوشخبری بھی دی گئی کہ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے ۔ ان کی دنیا بھی سدھرے گی اور آخرت بھی ، کیونکہ انہوں نے دین کو دُنیا اور اس کے عیش و آرام و آسائش پر ترجیح دی ہے ، محض دین کی خاطر گھر سے بے گھر ، در سے بے در ، وطن سے بے وطن ہو کر دوسرے شہر یا علاقہ میں ہجرت کی ہے ، ایک شہر یا علاقہ یا ملک جب اللہ کی بندگی کرنے کے لیے تنگ ہو گیا تو دوسری جگہ چلے گئے ۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے بے حساب اجر ہے جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کر لیں اور راہِ حق سے نہ ہٹیں ۔ یہ بے حساب اجر کا وعدہ صرف ہجرت کرنے والوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں ۔

ہجرت کے موقع پر ہدایات قرآن مجید میں مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کو صرف ہجرت کی تلقین ہی نہیں کی گئی ، بلکہ دو قسم کی ہدایات بھی دی گئیں ۔

چونکہ مسلمان ہجرت کر کے ایک عیسائی ملک کی طرف جا رہے تھے اس لیے اِس موقع پر سورۂ مریم نازل کی گئی جس کے ابتدائی دو رکوعوں میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزین گروہ کی حیثیت سے جا رہے تھے ، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملہ میں ذرّہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی بلکہ چلتے وقت زادِ راہ کے طور پر یہ سورت ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں ، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو ۔

دوسری ہدایت یہ کی گئی کہ :-

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ (العنکبوت: ۴۶)

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے اُن لوگوں کے جو ظالم ہیں - اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی - ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مُسلم (فرمان بردار) ہیں -

یعنی اہل کتاب (عیسائیوں) سے جب سابقہ پیش آئے تو ان میں سے جو ظالم ہیں ان سے تو اُلجھنے کی ضرورت نہیں، مگر جو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار ہوں ان سے نہایت معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں اور افہام و تفہیم کے انداز میں بحث کرو - ان کو بتاؤ کہ ہم کوئی متعصب گروہ نہیں ہیں جو اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب کو مانتے ہوں اور تمہارے ہاں آئی ہوئی کتابوں کو نہ مانتے ہوں - ہم تو حق کے پرستار ہیں - خدا کی طرف سے جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے اُسے بھی برحق مانتے ہیں اور جو کچھ تمہارے ہاں آیا ہے اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں - ہمارا خدا اور تمہارا خدا جدا جدا نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا ہے جس کے ہم بھی ماننے والے ہیں اور تم بھی - ہم نے اُسی ایک خدا کی بندگی و اطاعت کا طریقہ اختیار کیا ہے -

ہجرت حبشۂ اُولیٰ

حالات جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵؁ عام الفیل (۵؁ بعدِ بعثت) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشة فان بها ملكًا لا يُظلم عنده احد وهي ارض صدق حتى يجعل الله لكم فرجًا مما انتم فيه - "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ - وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے - جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔" اس ارشاد کے مطابق حبش کی طرف پہلی ہجرت ہوئی جس میں گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی - قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے شُعَیبہ کے بندرگاہ پر ان کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے -

پہلی ہجرت کے مہاجرین

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس پہلی ہجرت کے مہاجرین کی جو فہرست دی ہے وہ یہ ہے:-

۱- بنی امیہ میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان -

۲- ان کی بیوی حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ اُن کے ساتھ ام ایمنؓ بھی گئی تھیں) -

۳- بنی عبدِ شمس بن عبد مناف میں سے حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ -

۴- ان کی بیوی سہلہؓ بنت سُہیل بن عمرو (جو بنی عامر بن لؤی میں سے تھیں) -

۵- بنی اسد بن عبد العزیٰ بن قصی میں سے حضرت زبیرؓ بن العوام - (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)

۶- بنی عبد الدار بن قصی میں سے حضرت مصعبؓ بن عمیر -

۷- بنی زہرہ بن کلاب میں سے حضرت عبد الرحمنؓ بن عوف -

۸- بنی مخزوم میں سے حضرت ابو سلمہؓ بن عبد الاسد -

۹- ان کی بیوی اُم سلمہؓ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور ابوجہل کی سگی چچا زاد بہن تھیں) -

۱۰- بنی جمح میں سے حضرت عثمانؓ بن مظعون - (ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ماموں) -

۱۱- حلفائے بنی عدی میں سے عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (حلیفِ آل خطاب) -

۱۲- ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ - (یہ خود بنی عدی میں سے تھیں) -

۱۳- بنی عامر بن لؤی میں سے ابو سبرہؓ بن ابی رُہم -

۱۴- بنی الحارث بن فہر میں سے سُہیلؓ بن بیضاء -

ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے ان پر دو اور ناموں کا اضافہ کیا ہے - حاطبؓ بن عمرو بن عبد شمس اور عبد اللہؓ بن مسعود حلیفِ بنی زہرہ - ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ بعد میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بھی ان سے جا ملے تھے - مگر موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ وہ پہلی ہجرت میں نہیں بلکہ دوسری ہجرت میں گئے تھے - اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود پہلی ہجرت کے مہاجرین میں سے نہیں بلکہ دوسری ہجرت کے مہاجرین میں سے تھے - نیز زرقانی نے بعض سیرت نگاروں کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابو سبرہؓ کے ساتھ اُن کی بیوی اُم کلثومؓ بھی گئی تھیں جو سُہیل بن عمرو کی دوسری بیٹی تھیں - بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ان میں سب سے پہلے نکلنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے، اور ان کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی ہے -   (باقی)